جدید عہد کا سماجی منظر نامہ اور اُردو ناول

ثمینہ یسین پی۔ ایچ۔ ڈی سکالر، شعبہ اُردو دی ویمن یونیورسٹی، ملتان
نجمہ عثمان لیکچرار، شعبہ اُردو دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

Abstract

Literature is a criticism of life and the genre of literature "Novel" presents a complete picture of life after the Dastan due to its length and viscosity. Following Mathew Arnold and Premchand, literature is not merely influenced by the revolutions of the time, but rather the forerunner of revolutions, and the writer is the interpreter of social problems as well as the one who presents solutions to social problems. Great Novels written in different languages also seem to refine and promote freedom, love and social values with the reflection of social problems through narrative dialogue and characters at the lower level of their text. Before the Urdu novel, the stories written in the subcontinent like Kalila and Damna . Romantic stories translated into poetry (Heer ranjha, Saiful Muluk etc.) have been written directly or indirectly from the perspective of the encouraging future of the society. Early impressions of the Urdu novel written in the nineteenth century are adorned with objectivity. Marat-ul-Aros, Amrao Jan ada, Bazar Husan and Medan e amal are also the precursors of the social problems of this era and also the fodder for the ills of the society in different ways. Even fiction with progressive ideals seems to communicate the desire for a more inclusive society. During the life of the novel, in reaction to the heaviness of the objectivism of the early period, some kind of correction was tried to be expelled from the novel, but in the Urdu novel of the modern era, it is in good spirits without becoming a diagnostician of social problems and a narcissist. Future novelists are writing influential Novels. At the head of the modern age, the burden of the problems of the ancient era is also there in original or in modified structure and also the load of the empty life, ironically, of the globalization that transforms closeness into distance and distance into closeness protected by the slaps of consumerism. If the novelists draw the map of these serious social problems and the moment present the solution to these problems without undermining the technical accessories, then they will be able to become immortal. In this paper, the social problems presented in the novels written in the 21st century, respectively, "Po Ke Maan Ki Dunya", "Neeli Bar" and "Mangi Hui Mohabbat" will be explored in the context of the modern era.

Key words: Literature and Writers, Social Landscape, Class Issues, Exploitative behavior, Consumerism, Globalization, Neli Bar, Mangi Hwe Muhabbat, Poki Man Ki Dunya

ناول صنعتی دور میں جنم لینے والی صنفِ ادب ہے، داستانیں مافوق الفطرت کرداروں اور واقعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ انسانی شعور جب حقیقتوں سے کسی نہ کسی سطح پر مطابقت رکھنے والے واقعات کا متمنی اور متقاضی ہوا تو داستان کی جگہ ناول ادب کے اُفق پر

طلوع ہوا۔ اس سے پہلے کہ ناول اور سماجی منظر نامے کے تعلق باہمی پر بات کریں ادب اور سماج کی تعریف پر ایک نظر ڈالنا مفید رہے گا۔ ادب ہے کیا؟ ادب زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ادب کیا محض ترجمان ہی ہے؟ میتھیو آرنلڈ کے نزدیک "ادب زندگی کی تنقید ہے"۔ ادب کی تعریف کے اسی نظریے سے پریم چند اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ وہ (ادب) اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے"[i]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادب زندگی کا عکاس بھی ہے اور اس کی بدلتی قدروں کا غماز بھی۔ ٹالسٹائی کا یہ قول اس خیال کی صراحت سے تائید اور توثیق کرتا ہے کہ فنکار کا کام صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ واقعات اور حادثات کا ذکر کرے بلکہ وہ انکشاف بھی کرتا ہے، اس انکشاف میں خوش آئند مستقبل کے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ گورکی بھی عصری آگہی کے ساتھ ساتھ خوش آئند مستقبل کی بشارت کو اصل ادب کا وظیفہ قرار دیتا ہے۔

محولہ بالا اقوال اور تعریفوں سے یہ بات مترشح ہے کہ ادب صرف حالات کے متغیر منظر ناموں کا عکاس نہیں ہوتا، ادب صرف انقلابات زمانہ سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ انقلاب کا پیش رو بھی بن جاتا ہے۔

ادب کی تعریف کے بعد سماج کو سمجھنا بھی ضروری ہے "سماج" کے حوالے سے ڈاکٹر محمد افضال بٹ رقم طراز ہیں

"سماج" معاشرہ یا سوسائٹی انسانوں کے اس بڑے گروہ کو کہتے ہیں جو باہمی تعلق و تعامل کے اعتبار سے انفرادی خصوصیات کا حامل ہو۔ اس میں اقدار حیات اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ ذہنی، روحانی اور نظریاتی اختصاص اس طور پر موجود ہو جو اسے دیگر مشابہ گروہوں سے ممتاز کرے"۔[ii]

ادب اور سماج کے تعلق باہمی پر ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی رائے کو مختصراً بیان کرتے ہیں کہ:

"ادب میرے خیال میں زندگی، تہذیب، کلچر کا عکاس ہے۔ ترجمان اور نقاد ہے۔ میرے خیال میں ادب ایک سماجی عمل ہے"[iii]

اس رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے اس تعلق پر تھوڑی روشنی ڈال لیتے ہیں تاکہ مفہوم واضح ہو سکے۔

ادب، ادیب تخلیق کرتے ہیں اور ادیب کسی نہ کسی سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اگر سماج کاہ کشاں ہے تو ادیب اس کا ایک ستارا ہے۔ اس نظام کی ایک کڑی ہونے کے ناطے وہ سماجی تغیر و تبدل کا شاہد بھی ہوتا ہے اور ایک حد تک مشہود بھی۔ وہ ہئیت اجتماعیہ پر وارد ہونے والی ہر آفت کا ساجھی دار ہوتا ہے۔ اپنی طبعی حساسیت کی بنا پر وہ دکھ سکھ سے تمام افراد معاشرہ کی نسبت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ قوت اظہار پر دسترس کی بدولت وہ ان اثرات کا جو اس پر مرتب ہوتے ہیں، ابلاغ بھی کرتا ہے۔ یوں وہ اس شمار دانہ تسبیح میں شامل بھی ہے اور اپنے انفراد کی وجہ سے خارج بھی۔ وہ عام نہیں بلکہ اس تسبیح میں امام ہے۔

سماج کسی ترقی یافتہ منزل کی طرف عازم سفر ہو تو پرندوں کے غول کی طرح سب سے آگے محوِ پرواز پرندے کی مانند ادیب طوفانِ بادوباراں کے سامنے سینہ سپر ہو کے ہر تھپیڑے سے پہلے خود متاثر ہوتا ہے۔ اپنے اندیشہ ہائے دور دراز سے ایسی منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے جہاں آب و دانہ کی فراوانی جوئندگان کی منتظر ہوتی ہے۔ اپنی دوربین نگاہوں میں گندھی بصیرت کی بدولت وہ لمحہ موجود کا شارح ہی نہیں ہوتا، خوش آئند مستقبل کا صناع بھی بن جاتا ہے۔

لمحہ موجودہ کے سماجی مسائل میں کچھ نئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو ہر دور کا مقسوم رہے ہیں۔ ان میں سے بعض جوں کے توں ہیں اور کچھ کی زہرناکی فزوں تر ہو گئی ہے۔

زیر نظر مضمون میں جن تین ناولوں (پو کے مان کی دنیا، نیلی بار، مانگی ہوئی محبت) کا اختصاصی جائزہ لیا جا رہا ہے ان میں قدیم سماجی مسائل کی عکاسی بھی ہے اور تازہ و جدید مسائل کی ترجمانی بھی۔ مگر فنی لوازمات کی پاسداری کے ساتھ ان سماجی امراض کی چارہ گری کی سعی بھی ان ناولوں میں نظر آتی ہے۔

طبقاتی تقسیم ایک ایسا مسئلہ ہے جو عصرِ حاضر میں منصہ شہود پر نہیں آیا بلکہ آغازِ آفرینش سے کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ اس عہد میں یہ مسئلہ اس لحاظ سے گھمبیر ہو گیا ہے کہ جدید ذرائع مواصلات و سوشل میڈیا اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے اشتہا انگیز مناظر اس طرح سے دیکھائے جاتے ہیں کہ بہترین رہائش گاہیں، محل نما مکانات، کھانے پینے کی انواع و اقسام کی اشیا اور سہولیات کے نت نئے مناظر دیکھنے کے بعد محرومی کا احساس کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ یوں جدید عہد کے بیشتر سماجی مسائل، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، عدم مساوات اور معاشی تفاوت کی بدولت جنم لیتے ہیں۔ خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں طبقاتی تقسیم کی یہ خلیج زیادہ گہری اور پاٹ دار ہے جہاں ایک طبقہ بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے سسک سسک کر زندگی گزار دیتا ہے تو دوسری جانب طبقہ اشرافیہ کے ہاں وسائل کا ضیاع نظر آتا ہے بلکہ یوں کہنا مناسب رہے گا کہ ہمارا مقتدر طبقہ عوام کے احساسات کو کچل کر، انھیں تقدیر پرستی اور

قناعت جیسے اسباق ازبر کرواکے خود دنیامیں جنت کے مزے لوٹنے کا چلن روا رکھے ہے۔ لیکن جدید دور کا نوجوان سمجھ بوجھ اور شعور رکھتا ہے وہ حقائق کو من وعن قبول کرتے ہوئے صابر اور قانع رہنے کی بجائے اشرافیہ کے چہرے پر موجود نقاب کو نوچ پھینکتا ہے۔ طاہرہ اقبال اس طبقاتی تقسیم کے سخت خلاف ہیں۔ نیلی بار کے سماجی منظر نامے کو تشکیل دیتے ہوئے انہوں نے استحصالی رویوں کو بھرپور طریقے سے اُجاگر کیا ہے۔

ناول میں موجود نوجوان کرداروں عالیہ اور عمائمہ کا مس زارا فلک شیر کی رئیسانہ شان و شوکت کو دیکھ کر کیا گیا تبصرہ عوام الناس کے ذہنوں میں کلبلاتے سوالوں کو جب الفاظ کا جامہ پہناتا ہے تو اس کے یہ الفاظ در حقیقت خدا سے شکوہ کناں ہونے کی بجائے طبقہ اشرافیہ کے منہ پر وہ طمانچہ رسید کرتے ہیں جس کی گونج ساکت اور جامد لبوں کو جنبش عطا کرتی ہے کہ جب تک طبقاتی تفریق کا سد باب نہیں ہو گا تب تک عوام یونہی دنیا کے جہنم زار میں جلتی رہے گی۔

> ''لگتا تھا سال اوّل کی یہ طالبہ قدرت کی اس ناانصافی پر رو پڑے گی۔ آخر انصاف مانگا جائے تو پھر کس سے۔۔۔ کتنی کٹھور اور ناانصاف ہے یہ فطرت بھی۔ کچھ عورتوں کے حسن جوانی کو تو کٹر کٹر جانوروں کی طرح چباڈالے اور کچھ کو پورا اختیار دے دے کہ جب تک چاہیں جوان رہیں جب تک چاہیں زندہ رہیں، کینسر اور ایڈز سے بھی جانبر ہو کر امریکہ ویورپ سے لوٹ آئیں اور ہمارے ٹی بی اور دمے سے مر جائیں۔ خدا کو چاہیے تھا بس اسی کلاس کو پیدا کرتا، دوسرے طبقات کو زندگی کے عذاب میں جھونکنے کی ضرورت ہی کیا تھی''[iv]

یہ المیہ صرف پاکستانی سماج کا نہیں بلکہ تیسری دنیا کے تمام ممالک کم و بیش مسائل کی نوعیت اور شدت کے لحاظ سے اسی طرح کی صورتحال سے دوچار ہیں، جہاں بسنے والوں کو نہ اچھی خوراک میسر ہے اور نہ ہی بیماری کی صورت میں شافی علاج، ٹیکسوں اور محصولات کی مد میں جمع کیا گیا روپیہ عوام کی فلاح پر خرچ ہونے کی بجائے مقتدر طبقے کی عیاشیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔

اقبال عابد نے اپنے ناول ''مانگی ہوئی محبت'' میں ہمارے ایک اور سماجی رویے کی نشاندہی کی ہے کہ ہمارے ہاں سست الوجودی اور کاہلی اس طرح سے سرایت کر گئی ہے کہ لوگ خوشحال تو ہونا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے محنت اور کوشش سے جی چراتے ہیں وہ بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر ہوتے ہیں کہ راتوں رات کوئی ایسا معجزہ رونما ہو جائے جس سے اُن کے حالات یکسر بدل جائیں۔ وہ امیروں کے شاہانہ طور اطوار دیکھ کر محض کڑھتے رہتے ہیں یا اپنے نصیب کو کوستے ہیں۔

ناول کا مرکزی کردار غوث علی فطرت سے والہانہ لگاؤ رکھتا ہے۔ اس نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے وہ اپنے باپ کی بیٹری چلاتا ہے اور اُسی رزق پر قانع ہے لیکن جب آرزو اُس کی زندگی میں آتی ہے اور پھر اچانک اُسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو اُسے اپنی غربت کا احساس ہوتا ہے وہ مضطرب ہے ایسے میں اُس کے سر رضا کی گفتگو تفکر کے نئے در وا کرتی ہے۔

"مسٹر غوث علی! سارا جہان قناعت پسندی کے نام پر بے کار بیٹھ جائے تو کیا بنے گا؟ اور سن سائیں لوکا! آرزو اور میرے جیسے شہریوں کے لیے تمہارا یہ بیلا، یہ لہلہاتے کھیت اور تمہاری جھونپڑی کچھ وقت کے لیے دلکش ہے۔ سیر کے لیے۔ انجوائے کرنے کے لیے۔ مستقل رہنا پڑے تو باں باں ہو جائے ہم جیسے لوگوں کی"[v]

نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد یہ سمجھتی ہے کہ سرکاری نوکری مل جائے تو حالات بدلے جاسکتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ چھوٹا موٹا کاروبار کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں، یوں سرکاری نوکری نہ ملنے کی صورت میں وہ مایوسی اور ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتے ہیں حالانکہ دیکھا جائے تو محنت میں کیسی عار۔ کام کوئی بھی ہو اگر محنت اور لگن سے کیا جائے تو اللہ کی ذات اس رزق میں برکت ڈالتی ہے۔

"سر نے قہقہہ لگایا۔

"کبھی نوکری سے کوئی امیر ہوا؟ اپنی صلاحیتیں کرائے پر دو گے تو ساری زندگی گزر اوقات کرو گے۔ اپنا کام کرو غوث۔ سوچو۔ سوچ سوچ کے اپنا کام شروع کرو۔ اس کام سے عشق کرو۔ اوہ ہاں یار عشق تو تم آرزو سے کر بیٹھے ہو چلو یوں کرو کام سے عشق نہ کرو مگر عشق کی وجہ سے کام کر لو پھر بھی کام بن جائے گا"[vi]

درج بالا اقتباسات مصنف کے نکتہ نظر کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ معاشی آسودگی سماج کی مجموعی ترقی اور خوشحالی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

عورت کے ساتھ ہونے والا ظلم اور ناانصافی جدید عہد کے منظر نامے میں کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ پدرسری سماج میں عورت کے حقوق کی پامالی ہر دور میں ہوتی آئی ہے۔ وہ عورت جو پڑھ لکھ کر اپنے خاندان کی تکریم میں اضافے کا باعث بنتی ہے جو مرد

کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھائے باہر کے اور گھریلو فرائض کو بھی بہ احسن نبھاتی ہے کیا وہ آج مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہے ؟ نہیں ایسا ہر گز نہیں۔

آج بھی شہروں اور دیہاتوں میں غیرت کے نام پر عورت کا قتل ہوتا ہے ایسی بہت سی مثالیں ہمارے گرد وپیش میں موجود ہیں۔ ادیب معاشرے کا ایک فرد ہونے کے ناطے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال ایک نڈر اور بے باک لکھاری ہیں انہوں نے نیلی بار میں ان ناانصافیوں اور بنیادی حقوق کی پامالی کے خلاف کھل کر لکھا ہے اور بڑے معزز گھرانوں کے وہ حالات رقم کیے ہیں جن پر انسانیت بھی شرما جائے۔ جہاں مرد ہر طرح سے آزاد اور خود مختار ہے اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں وہ جس کے ساتھ مرضی رضامندی سے یا زور زبردستی جنسی تعلقات قائم کرے وہاں معاشرے کی غیرت پر کوئی سوالیہ نشان نہیں اُٹھتا۔ لیکن اگر عورت اپنی اسی فطری خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی خواہش کی تکمیل کا کوئی جائز ذریعہ نہ پا کر، ایک گناہ کر بیٹھے تو اس کا سر قلم کر کے تھال میں سجا کر گھر کی دیگر خواتین کو عبرت سکھانے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر مذہبی اور شرعی حدود و قیود کی بات کی جائے تو کیا وہ صرف عورت پر لاگو ہوتے ہیں مرد پر کیوں نہیں ؟؟ جرم کی سزاوار صرف عورت ہی کیوں ٹھہرائی جاتی ہے ؟

یہ وہ سوالات ہیں جو مصنفہ نے متن کی زیریں سطح پر اُٹھائے ہیں۔ ہمارے سماج میں آج بھی صفورہ، بختاور اور پاکیزہ جیسی نہ جانے کتنی عورتیں اپنے ناکردہ گناہوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں ہاں یہ الگ بات ہے کہ اب سوشل میڈیا کی وجہ سے وقتی طور پر سہی کچھ آوازیں بلند ضرور ی ہوتی ہیں لیکن پھر یہ چیپٹر ہمیشہ کے لیے کلوز کر دیا جاتا ہے۔

آج بھی نہ جانے کتنی پاکیزائیں خاندان کی جائیداد کی محافظ بن کر، اپنی فطری خواہشات کا گلا گھونٹ کر، اونچی پگوں اور شملوں کا وقار برقرار رکھے ہیں۔ وجود میں ہونے والی شکست وریخت سے کسی کا کیا لینا دینا۔

"اس کے دونوں بھائی بناوٹے کے شاہانہ انداز میں بیاہے گئے اُسے تو وٹے کی توقیر بھی نہ ملی

کیونکہ وہ کوئی چھوٹی ذات نہیں بلکہ ملکانی تھی"[vii]

جدید دور میں بچوں کی شادیاں کرنا اور نکاح جیسے آسان اور جائز فرض کو مشکل تر بنا دیا گیا ہے جس سے پھر کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔ کبھی اولاد کی طرف سے دقت پیش آتی ہے تو کبھی والدین کے رویے خود غرضانہ سوچ پر مبنی ہو جاتے ہیں۔

"مانگی ہوئی محبت" کے مصنف اقبال عابد نے اسی سماجی اور معاشرتی تناظر میں ذات پات کے نظام میں جکڑے غریبوں کے رویوں کو بھی مترشح کیا ہے جہاں اللہ وسایا اور اس کی بیوی اپنی اکلوتی بیٹی پروین (دستگیر کا رشتہ مانگنے اور بیٹی کی پسندیدگی جاننے کے

باوجود) کو محض اسے لیے بیاہنے پر آمادہ نہیں کہ ایک تو ان کا بیٹی کے سوا کوئی سہارا نہیں، دوسرا وہ اپنی ذات برادری سے باہر رشتہ کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ لڑکے کا شہر میں کاروبار بھی ہے اور وقتاً فوقتاً اُن کی مالی مدد بھی کرتا رہتا ہے۔ بیٹی کے گھر سے فرار ہو جانے کے بعد وکیل کی طرف سے کیا گیا سوال ان کی سوچ کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

> ''نہیں پتر اس کی بیوی کہاں ؟ اس کی ماں جب تک زندہ ہے، اس کی شادی نہیں ہونے دے گی۔ یہ بات سارا جہاں کہتا ہے۔ کھوتے والی ضد ہے اس کی جی۔ نئے نئے بہانے بنا کے ساری برادری کے رشتے دفع دور کر چکی ہے'' مائی بولی ''برادری سے باہر بھی مل سکتا تھا اُسے رشتہ''
>
> بزدار صاحب نے کہا۔
>
> ''کمہار کو کمہار ہی دیں گے اور کون دے گا پتر ؟''
>
> مائی کے چہرے پر حقارت نمایاں تھی''[viii]

اس طرح کے رویے ہمیں اکثر و بیشتر اپنے اردگرد دکھائی دیتے ہیں۔ پیشوں کو ذات سے منسوب کر دینے والے یہ غریب اور متوسط طبقے کے لوگ اپنے سے چھوٹی ذات میں رشتہ کرنا توہین سمجھتے ہیں دنیا جتنی مرضی ترقی کرتی چلی جائے ہمارے سماج کے باسیوں میں ذات پات، نسل برادری جیسے تصورات اس قدر راسخ ہو چکے ہیں کہ ان سے مکمل طور پر چھٹکارہ پانا بہت مشکل ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وسائل ہونے کے باوجود بعض لڑکوں کے والدین اُن کی بروقت شادی نہیں کرتے، اس کے پیچھے بہت سے نفسیاتی محرکات ہوتے ہیں۔

سماج کی بنیادی اکائی خاندان ہے۔ ایک خاندان میں رہنے والے مختلف رشتوں اور ناطوں کے ذریعے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اس میں والدین، بہن بھائی، میاں بیوی، دیور نندیں ہیں جو ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں اُن کے درمیان جو فاصلے پیدا ہو رہے ہیں اور یہ مسائل جو گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اُن کے بارے ہمارا اُردو ناول موثر طریقے سے عکاسی کرتا ہے۔ نیلی بار میں طاہرہ اقبال نے باپ کی سخت گیر طبعیت اور اولاد بالخصوص بیٹیوں کے حوالے سے اُن ماؤں کے کردار کو بھی اُجاگر کیا ہے جو باپ اور بیٹی کے درمیان اپنی کج فہمی کی بدولت ڈر اور خوف کا رشتہ پیدا کر دیتی ہیں جو بہت سے مسائل کو جنم دیتا ہے۔ بختاور کی موت کا سبب بھی یہی خوف بنتا ہے۔

> ”بتاتی ہوں نا، تیرے باپ کو اُنہیں تو تُو اچھی طرح جانتی ہے۔ ایک دبکے کی مار ہے تو وہیں دم نکل جائے گا تیرا۔ ذرا آلیں باہر سے تو تیری خبر لیتے ہیں“[ix]

عام طور پر ہمارے سماج میں جو جاگیر دار طبقہ ہے اُن کے ہاں بالخصوص اور عوام الناس میں بالعموم یہ رویہ پایا جاتا ہے کہ جب اولاد کو اپنے سایہ عاطفت اور سایہ تربیت میں نہیں رکھا جاتا اور اُن پر ذمہ داریاں ڈال کے یا انہیں کچھ اختیارات دے کر اُن کی تربیت نہیں کی جاتی۔

تو ایسے میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کی صورت میں یا اُس کے ضعیف ہو کر عضو معطل بن جانے کی صورت میں اولاد کا بگڑ جانا ایک فطری امر ہے۔ جس میں ماں کا بنیادی کردار ہوتا ہے کیونکہ وہ اولاد کو باپ کے خوف اور دبدبے میں رکھ کر لاشعوری طور پر اُن کے درمیان فاصلے پیدا کر دیتی ہے۔ ”مانگی ہوئی محبت“ میں دلاور خان کی ماں ان پڑھ ہونے کے باوجود معاملہ فہم اور سلجھی ہوئی خاتون ہے۔ اُس نے اپنے بھائیوں کو اسی طرح بگڑتے دیکھا تھا۔ اس لیے وہ دلاور خان کو اپنے سے زیادہ باپ کے ساتھ منسلک کر دیتی ہے۔

> ”پتر جو مائیں اپنے بیٹوں کو باپ کی بجائے اپنے پہلو میں بیٹھائے رکھتی ہیں وہ اُن پر ظلم کرتی ہیں۔ خاص طور پر ہم زمینداروں کے بچے اسی وجہ سے بگڑتے ہیں۔ وہ باپ کے مسئلے مسائل نہیں سمجھ سکتے۔ یا تو وہ رَنوّں بن کر عورتوں جوگے رہ جاتے ہیں یا پھر بڑے ہو کر ماں کے پہلو سے اُڈاری مارتے ہیں اور کسی کوٹھے والی عورت کے پہلو میں ڈھیر ہو جاتے ہیں“[x]

درج بالا اقتباس میں مصنف نے اس سماجی مسئلے کی نشاندہی کے ساتھ زیریں سطح پر اس کا حل پیش کر کے اپنے موقف کو بھی واضح کر دیا ہے۔

جدید عہد کو ”گلوبل ورلڈ“ کے نام سے جانا جاتا ہے یعنی پوری دنیا سمٹ کر ایک ویلیج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس گلوبلائزیشن نے پوری دنیا کو اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے۔ معلومات کے تبادلے کی سطح تک تو انسان ایک دوسرے کے قریب ہوا ہے لیکن صارفیت کی بوجھل مصروفیات نے انسان کو حقیقی رشتوں سے دور کر کے مشین کے ایک پرزے میں متشکل کر دیا ہے۔ یوں انفرادی اور اجتماعی ہر دو لحاظ سے انسان مایوسی اور تنہائی کا شکار ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانی زندگی کو مادیت سے دوچار کر کے المناک حد تک متاثر کیا ہے۔ وقت کی قلت صبر اور برداشت کو کھا کر زندگی کو غیر متوازن رویوں کی جانب دھکیل رہی ہے

یوں آج کا سماج محبت، خلوص، مروت اور رواداری کی بجائے تعصب، تنگ نظری، حسد، تعیش پسندی اور طاقت کے حصول کا اسیر بن کر ذہنی مریض بن چکا ہے۔ خواہشات کی لگام چھوٹ جانے سے اپنے جیسے انسانوں کو روند دینے کا چلن ظلم و جبر اور استعماریت کی نئی تاریخ رقم کر رہا ہے جس میں ظالم بھی ہم خود ہیں اور مظلوم بھی۔

گلوبلائزیشن کے پھیلاؤ میں ذرائع ابلاغ کا اہم کردار ہے جدید عہد میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور مواصلات کے دیگر ذرائع نے ایک خطے میں بسنے والوں کے احوال وواقعات کو دوسروں تک برق رفتاری سے پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جدید دور کی فاتح قوم وہ ہے جو ٹیکنالوجی میں ترقی کی بدولت دیگر اقوام پر اپنی تہذیب و ثقافت کو غیر محسوس طریقے سے مسلط کر رہی ہے۔ امپورٹڈ کلچر کی یہ زہرناکی ہماری اقدار اور روایات کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے درپے ہے اس گلوبل ورلڈ کے حوالے سے مبین مرزا رقم طراز ہیں کہ:

> ”آج ہم سب گلوبل ویلیج میں زندہ ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، یہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں تہذیبیں اپنی شناخت کھو رہی ہیں اور ثقافتوں کے امتیازی نشانات مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ کوکا، برگر، فیس بک اور ورچوئل ریئلٹی کی یہ وہ دنیا ہے جس میں انسانوں کی زندگی روبوٹ جیسی ہوتی جا رہی ہے“[xi]

ادب اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں پر ادیب کی گہری نظر ہوتی ہے اس لیے گلوبلائزیشن کے اثرات ادب بالخصوص فکشن پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ گلوبلایشن کے چند بڑے مظاہر میں صارفیت، دہشت گردی اور سائبر کرائم ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں اور برانڈز کے اجرا سے نت نئے فیشنوں کو فروغ ملا ہے۔ فیشن کے رسیا امیر لوگ اور ایلیٹ کلاس اپنے ساتھ متوسط طبقے کو بھی سرپٹ دوڑائے پھر رہی ہے۔ غریب گھروں سے تعلق رکھنے والی بچیاں جب تعلیم یا ملازمت کے حصول کے لیے گھروں سے باہر نکلتی ہیں تو ان کا واسطہ ہر طرح کے افراد سے پڑتا ہے۔ ایلیٹ کلاس کا طرز زندگی اُن کے اندر احساس کمتری کو جنم دیتا ہے یوں اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ غلط راستوں کا انتخاب کر بیٹھتی ہیں۔ دوسرا اس اشتہا کو بڑھانے میں سوشل میڈیا کا بڑا ہاتھ ہے۔ جہاں ہر چیز کی اس طرح سے تشہیر کی جاتی ہے کہ وہ ضروریات زندگی کا ناگریز حصہ لگنے لگتی ہیں۔ طاہرہ اقبال نے ”نیلی بار“ میں کمال مشاقگی سے ان بدلتے رجحانات اور صارفیت کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"وہ لڑکیاں جن کے گھر والے (Mess) میس کے لیے دو ڈھائی سو روپیہ بھی مستقبل کی منصوبہ بندی میں اُدھار اُٹھا کر بھیجتے تھے کہ یہ سارے پیسے کل بہترین نوکری کی تنخواہ میں ڈیپازٹ ہو جائیں گے۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی ایڑھیوں، کیل مہاسے پلی سانولی جلد کو بے داغ اور گورا چٹا بنانے کے لیے امپورٹڈ کریمیں کہاں سے خریدیں۔ یہ امپورٹڈ اور مہنگی کریمیں جواب ہوسٹل کے ہر کمرے کی الماریوں میں بھری رہتی تھیں۔ اب تو صدیوں سے مّروج کپڑے اور روئی کے ماہانہ استعمال میں بھی پیڈز کا انقلابی خرچہ متعارف ہو گیا تھا۔ یہ بھی اب فیشن میں شامل تھا۔ مفت پوری ہونے والی ضرورتوں کو ٹریڈ کمپنیوں نے اس قدر Publicities کیا تھا کہ وہ بھی خریدی جانے والی انتہائی جائز ضروریاتِ زندگی بن گئی تھیں "[xii]

اسی طرح سے آگے چل کر وہ لکھتی ہیں کہ:

"برگر، سینڈوچ، پیزا، انقلابی ذائقے روایتی کھانوں کو چٹ کر گئے تھے۔ فاسٹ فوڈز نے بھوک اتنی بڑھادی، کہ تین وقت کے کھانوں کے اوقات اتھل پتھل ہو گئے تھے روز روز کھلنے والے مہنگے سکولوں نے اس بزنس کو خوب سہارا دیا تھا۔ بھاری فیس ادا کرنے والوں کو ان جدید ذائقوں کی لت پڑ گئی تھی۔ دیسی کھانوں کے ذائقے پینڈو اور ناپسندیدہ ہوتے جا رہے تھے "[xiii]

بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو بحیثیت مجموعی ان اسباب کی بدولت ہمارا سماج بُری طرح سے متاثر ہو رہا ہے۔ ہماری اقدار شکست و ریخت کا شکار ہیں۔ نت نئی اشیاء کے وجود میں آنے سے زندگی سہل کم اور پیچیدہ زیادہ ہو گئی ہے۔ کیا برگر، سینڈوچ،۔۔۔۔۔ ہماری مقامیت کو فروغ دے رہے ہیں؟ فاسٹ فوڈز کے باکثرت استعمال سے صحت کس طور متاثر ہو رہی ہے؟ یہ تمام امور غور طلب ہیں۔ والدین دن رات معاشی حالات کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں سرگرم ہیں۔ اُن کے پاس اولاد کی ذہنی، اخلاقی اور جزباتی تربیت کرنے کا وقت نہیں ہے۔ نتیجتہً والدین اور اولاد کے مابین فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اولاد گھر سے باہر جزباتی سہارے تلاش کرنے لگی ہے۔ مزید سمارٹ فون کے آ جانے سے قربتیں فاصلوں میں اور فاصلے قربتوں میں بدل چکے ہیں۔ گھر کے افراد ایک جگہ

بیٹھے بھی ہوں تو ذہنی لحاظ سے ایک دوسرے سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ سوشل میڈیا(فیس بک، انسٹا گرام، ٹوئیٹر) کا مثبت استعمال کم اور منفی زیادہ ہو چکا ہے۔ تفریح کے نام پر دیکھے جانے والے پروگرام ہمارے کلچر کو فروغ دینے کی بجائے ایسی صورتحال دکھانے میں جتے ہیں۔ جو کسی لحاظ سے ہماری اقدار سے میل نہیں کھاتے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''پوکے مان کی دنیا'' جدید ٹیکنالوجی اور گلوبلائزیشن کے اثرات کے حوالے سے ایک منفرد تخلیق ہے جس میں انہوں نے جنریشن گیپ، مادیت پرستی، اقدار کی ٹوٹ پھوٹ، سائبر کرائم، کارٹون، ویڈیو گیمز کے بچوں کی نفسیات پر اثرات کے حوالے سے ایک عمدہ تخلیق ہے جو قاری پر سوچ کے کئی در وا کرتا ہے۔ ڈاکٹر فخر الکریم اس ناول کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''جدید اردو ناول نگاری میں مشرف عالم ذوقی بھی ایک اہم نام ہے ''بیان'' سے لے کر ''لے سانس بھی آہستہ ''تک ذوقی نے متعدد ناول لکھے۔ لیکن ان کا ناول ''پوکے مان کی دنیا'' ہماری توجہ کا مرکز اس لیے بن جاتا ہے کہ انہوں نے اس میں نئی نسل کی دلچسپیوں اور نئے سماجی برتاؤ کی پیشکش اور طریق زندگی پر بڑا اچھا مسالہ اکٹھا کر دیا''[xiv]

مشرف عالم ذوقی کا تعلق ہندوستان سے ہے اور وہ بطور فکشن نگار اردو ادب کے منظر نامے میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مذکورہ بالا ناولوں میں اُن سماجی مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو قدیم دور میں بھی تھے اور جدید دور میں بھی پائے جاتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کا ''نیلی بار'' اور اقبال عابد کا ''مانگی ہوئی محبت'' حال ہی میں منظر عام پر آئے ہیں جن کا زمانہ تسوید بالترتیب ۲۰۱۷ء اور ۲۰۱۸ء ہے جبکہ ''پوکے مان کی دنیا'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ زیر نظر مقالے میں ''پوکے مان کی دنیا'' کا آخر میں جائزہ لینا اس لیے مقصود ہے کہ اس ناول میں جدید دور کے مسائل جو الیکٹرونک میڈیا کے استعمال سے جنم لیتے ہیں، کو موضوع میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور عصر حاضر میں ان مسائل میں شدت سے اضافہ ہو رہا ہے اگر ان پر قابو نہ پایا گیا تو ممکن ہے کہ ہم نہ صرف اپنے تشخص سے محروم ہو جائیں گے بلکہ ہماری نوجوان نسل اور بچوں کا مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔

اس ناول میں ایک کارٹون کردار ''پوکے مان کی دنیا'' کے ذریعے بچوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے اور اُن مسائل کو منظر عام پر لایا گیا ہے جو اس فینٹسی ورلڈ میں بچوں کو دھکیل دینے سے جنم لیتے ہیں جہاں طاقت اور قوت ہی سب کچھ ہے۔ بچے تخیلات کی دنیا میں اپنے کردار کو اُس سپر مین میں ڈھلتا ہوا پاتے ہیں۔ جس کے لیے کچھ بھی نہ ممکن نہیں ہو تا وہ کردار جو اپنے دشمنوں سے لڑ کر

انتقام لیتے ہیں، جس کے تحت بچوں کو صرف اُس کی جیت اور فتح پسند ہوتی ہے وہ اسے کسی حال میں ہارتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتے، یوں بچے حقیقی زندگی میں صرف مسابقت کو ترجیح دیتے ہیں۔ شکست انہیں کسی صورت قبول نہیں ہوتی۔

ہمارے حقیقی ہیروز کون ہیں؟ بچے اس سے نابلد رہتے ہیں۔ ان کے لیے سپرمین، سپائیڈرمین، فینٹم، ہیری پورٹر جیسے کردار ہی سب کچھ ہیں وہ سکول بیگ، شرٹس، لنچ باکس، جیومیٹری باکس، واٹر بوٹلز حتی کہ کچھ بھی لیں گے تو انہیں ان کرداروں کی تصاویر والی اشیا لبھاتی ہیں۔ ہمارے بچوں کے پاس تفریح کے لیے ویڈیو گیمز، سمارٹ فون، ٹی وی کارٹونز ہی ہیں۔ صحت مندانہ تفریح اور جسمانی کھیل کود کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں اور اس کے بھیانک نتائج جلد یا بدیر سامنے ہونگے۔

> ”بچے فینٹسی کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ بچے خوابوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ بچے NEO بن گئے ہیں جو خوابوں میں رہتا ہے۔ خوابوں کے درمیان ہی اٹھتا بیٹھا ہے۔ ذرا سوچو ہندوستانی بچوں کو یہ خواب کون دے رہا ہے۔ امریکی کہانیاں، جاپانی کہانیاں، چینی کہانیاں، لیکن بچوں کو پسند کیا ہے۔ WWF بچوں کو ایک آدمی کا جیتنا پسند ہے۔ اس فتح یا جیت کے بیچ کس کی جان جاتی ہے۔ بچے جاننا نہیں چاہتے۔ قانون کیا کہتا ہے۔ انصاف کیا ہے۔ بچے اس بحث سے بلند ہو گئے ہیں۔ وہ ظلم کا انت دیکھنا چاہتے ہیں“[xv]

یہ سب ہمارے سماج کے بچوں کے لیے سوئیٹ پوائزن ہے۔ یہ مسئلہ ہندوستان کا نہیں ہے ہم سب کا ہے۔ والدین کو وقت دینے کی ضرورت ہے۔ انہیں بچوں کو اپنی روایات اور اقدار سکھانی ہوں گی۔ بچوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہو گی۔ کیونکہ آج ایک کلک پر وہ سب دستیاب ہے جو بچوں کی فطرت میں موجود تجسس کو ابھارتا ہے۔ وہ وقت سے پہلے بالغ ہو رہے ہیں آج کا بچہ ایڈونچر کو پسند کرتا ہے اُسے علم نہیں کہ صحیح کیا ہے، غلط کیا ہے۔ کیا آج ویڈیو گیمز اور کارٹونز میں جنس کا جو کھیل دکھایا جاتا ہے، کرداروں کے ملبوسات، ان کی گفتگو ہمارے کلچر سے موافقت رکھتے ہیں، کئی ایسی ویب سائٹس ہیں جیسے روبلوکس، پر گیمز کھیلتے ہوئے بچے جنسی گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔ انہیں علم نہیں ہو پاتا کہ اس سب کے کیا نتائج ہوں گے، ان کی نفسیات کس حد تک متاثر ہوتی ہیں۔ یہ سب ان کی شخصیت کو کیسے Damage کر رہا ہے۔ آج بچوں میں پب جی گیم کھیلنے سے خودکشی اور قتل کے رجحانات دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ یہ سب بہت تکلیف دہ صورتحال ہے اور جدید عہد میں یہ مسئلہ شدت اختیار کر چکا ہے جب ”پو کے مان کی دنیا“ لکھا گیا تب حالات اتنے

کشیدہ نہیں تھے لیکن ایک ادیب معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والی صورتحال کو دیکھ کر مستقبل کی ہولناکی کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔

اس ناول میں بارہ سال کا ایک بچہ روی کنچن جو ماں باپ سے چوری چھپے بلیو فلم دیکھ لیتا ہے۔ جو سراسر والدین کی غفلت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اپنی ہم عمر دوست سونالی کے ساتھ اس کی رضامندی سے میاں بیوی کا کھیل کھیلتا ہے۔ جس کے بھیانک نتائج دو خاندانوں کو ہی نہیں پوری سوسائٹی کو بھگتنے پڑتے ہیں کیونکہ میڈیا اسے ریپ کیس کا نام دے کر جس طرح سے اُچھالتا ہے، وہ ایک معصوم بچے کو سنگین مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل ایسے یا اس سے ملتے جلتے واقعات کو جس طرح سے میڈیا پیش کرتا ہے اُس سے جرائم کے سدباب میں مدد ملے نہ ملے، جرائم کی شرح میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ نوجوانوں اور بچوں کو لگتا ہے وہ مشہور ہو رہے ہیں، ہیرو بن رہے ہیں۔ ریٹنگ کے چکر میں میڈیا اپنے اخلاقی فرض کو مکمل فراموش کر دیتا ہے۔

> ”اس ملک کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہوا کیا؟۔۔۔ اس نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔۔۔ مجھے
> جیسے کاٹ مار گیا ہو۔۔۔ نابالغ لڑکی کے ساتھ بلاتکار۔۔۔ رپورٹر نے انتہائی بھدے اور غلط
> طریقے سے ایک ہیڈنگ لگائی تھی“[xvi]

جب والدین، معاشرہ، قوانین بنانے والے ادارے، اور ریاست غفلت برتنے لگے تو پھر ایسے مسائل کا مورد الزام کسی ایک فریق کو ٹھہرانا ہرگز درست نہیں بلکہ اس ظلم میں سبھی قصوروار ہوتے ہیں۔ ترقی کی اس تیز رفتاری میں جو ہم نے کھو دیا ہے اُس سے قطعہ نظر جو پایا ہے وہ انسان کو درندہ بنانے کے لیے کافی ہے۔ ناول کا اختتام قاری کو جھنجوڑنے کے لیے کافی ہے۔ سنیل کمار اپنا فیصلہ سناتا ہے۔

> ”میں پورے ہوش وحواس میں یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ تعزیراتِ ہند دفعہ ۳۰۲ کے تحت۔۔۔
> میں اس نئی ٹیکنالوجی، ملٹی نیشنل کمپنیز، کنزیومر ورلڈ اور گلوبلائزیشن کو سزائے موت کا حکم
> دیتا ہوں۔۔۔ ہینگ ٹل ڈیتھ“[xvii]

جدید عہد کی بات کی جائے تو ہر زمانہ اپنے وقت میں جدید ہوتا ہے کیونکہ وہ گزرے وقت سے مختلف ہوتا ہے۔ مسائل ہر دور میں جنم لیتے ہیں، جب سے دنیا معرض وجود میں آئی ہے انسان کا ہر اٹھتا قدم اُسے ایک نئی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ نت نئی ایجادات، دریافتیں، انکشافات ہو رہے ہیں اور یہی زندگی ہے۔ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

شاید ہے تمام نا ابھی کائنات یہ ے
فیکون کن صدائے دم دما ہے رہی آ کہ

قدیم اور جدید میں فرق صرف اتنا ہے کہ اب دنیا بہت تیزی سے بدل چکی ہے اور بدل رہی ہے۔ تبدیلی کی یہ رفتار گزشتہ صدیوں سے کہیں تیز تر ہے۔ اس تیز رفتاری اور ٹیکنالوجی کی بدولت جو جنریشن گیپ یا کمیونیکیشن گیپ پیدا ہو چکا ہے اِس کو پُر کرنا بہت ضروری ہے۔ مادی آسائشات کا حصول خوشحال زندگی کے لیے ضروری ہے لیکن "مادہ" ہی سب کچھ نہیں جسم کے ساتھ روح کے تقاضوں کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ والدین کو اپنی اولاد کو اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے۔ وہ اُن کے ذہنی انتشار کو اپنی محبت سے توازن میں لا سکتے ہیں۔ کوئی بھی معاشرہ اپنی اقدار اور روایات سے مکمل کٹ کر پھل پھول نہیں سکتا۔ سماج کی ترقی اور بڑھوتری کے لیے مفاہمت کا راستہ منتخب کرنا ضروری ہے۔

سنیل کمار جب اپنی بیٹی ریا کے دوست ویلسی کے گھر آنے پر ناگواری کا اظہار کرتا ہے تو وہ بھڑک اُٹھتی ہے۔

> "آئی ڈونٹ کیئر۔۔۔ آپ کس زمانے میں رہتے ہیں اور ہمیں کیا بنانا چاہتے ہیں۔۔۔ ہم بن نہیں سکتے۔۔۔ ہمیں بنانے کی کوشش مت کیجئے۔۔۔Remember آپ نے ہمیں پیدا کیا ہے۔۔۔ کوئی احسان نہیں کیا۔۔۔ آپ نہیں پیدا کرتے۔۔۔ نہ کرتے۔۔۔ کوئی نہ کوئیWomb کہیں نہ کہیں ہمیں بنانے اور دنیا میں پھینکنے کے لیے تیار ملتی" [xviii]

بچوں کا ایسا رویہ یکدم نہیں بنتا، اِن رویوں کی حوصلہ شکنی کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے محرکات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ذہنی ہم آہنگی کا جو فقدان ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ "پو کے مان کی دنیا" جدید انسان کا المیہ ہے ڈاکٹر احمد صغیر لکھتے ہیں۔

> "پو کے مان کی دنیا، بچوں کے کارٹون کو تمثیل بنا کر جدید انسان کی بے چارگی اور شکست و ریخت کو بیان کرتا ہے" [xix]

جدید عہد کے سماجی منظر نامے میں اردو ناول نے اپنا کردار بخوبی نبھایا ہے اور ان تمام مسائل کو مکمل غیر جانبداری کے ساتھ منصہ شہود پر پیش کیا ہے، جن کے سدباب کے لیے کوششیں کرنا اور جدید ٹیکنالوجی کے تمام تر فوائد و ثمرات کے باوجود اس کا انسانی زندگی کے ساتھ جو ربط ہے اس کو مثبت بنانا اور اس میں توازن لانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

سماجی مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ تخلیق کار ایک خوبصورت مستقبل کی صناعی بھی کرتا ہے مگر اس صنّاعی کے دوران میں تخلیق کار فنی تقاضوں کو نہ صرف پورا کرتا ہے بلکہ کہیں بھی ادب پارے کے حسن و دلا آویزی کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔ اعلیٰ ادب اور بالخصوص ناول، جو سماجی و معاشرتی حیات کا جامع تر عکاس ہے، جب عکاسی و صناعی کا حامل ہو جاتا ہے تو اس کا فن مرورِ زمانہ سے ماند نہیں پڑتا۔ ایسے نقوش ہی ہوتے ہیں جو خونِ جگر کی آمیزش سے وجود میں آتے ہیں۔ یہی نقوش ہوتے ہیں جو آنی وفانی نہیں ہوتے۔ خالق کا مرکزی اور بنیادی وصف، محبت ہوتا ہے۔ سماج کی محبت میں بنائے گئے نقوش زیر و بم ممکنات اور دائمی رنگ ثبات سے مرصع ہوتے ہیں۔ خالقِ حقیقی کو زندگی محبوب ہے سو اُس نے ہر چیز کی فطرت میں حفظِ زندگی کا ذوق رکھ دیا ہے، بالکل اسی طرح مجازی خالق، اپنی سماجی زندگی کو انہدام سے بچانے اور اِسے دلکش دوام بخشنے کے لیے اپنے فن پارے میں ایسی عکاسی کرتا ہے جو بظاہر سماجی حیات کی تصویریں ہوتی ہیں مگر یہ تصویریں اپنے دامن پر لگے بدنما داغوں کو دھونے اور اپنے وجود پر لگے زخموں کی چارہ گری کے لیے فریاد کُناں دکھائی دیتی ہیں۔ ناول، زندگی کی مکمل تصویر ہونے کے ناطے، اپنے خالق سے اِسی ثبات و دوام کا متقاضی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ناول نگار جو عکاسی کے ساتھ صناعی کی قدرت رکھتا ہو، وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ موت اس کی برات نہیں ہو گی۔

حوالہ جات

i ۔ پریم چند، مضامین پریم چند، مرتبہ عمر رئیس، ڈاکٹر (علی گڑھ: یونیورسٹی پبلشرز، ۱۹۶۰ء)، ص ۲۳۸۔

ii ۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۳۔

iii ۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی زاویے (لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۵۱ء)، ص ۱۴۴۔

iv ۔ طاہرہ اقبال، ڈاکٹر، نیلی بار (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۵۴۴۔

v ۔ اقبال عابد، پروفیسر، مانگی ہوئی محبت (ساہیوال: انور سنز پبلشرز، ۲۰۲۰ء)، ص ۲۹۸۔

vi ۔ ایضاً، ص ۲۹۸۔

vii ۔ طاہرہ اقبال، ڈاکٹر، نیلی بار، ص ۴۹۷۔

viii ۔ اقبال عابد، پروفیسر، مانگی ہوئی محبت، ص ۲۱۲۔

ix ۔ طاہرہ اقبال، ڈاکٹر، نیلی بار، ص ۱۸۴۔

x ۔ اقبال عابد، پروفیسر، مانگی ہوئی محبت، ص ۱۱۶

xi ۔ مبین مرزا، ”عالمگیریت اور ہمارا عصری و ادبی تناظر“، مشمولہ روزنامہ ایکسپریس (کراچی، جون ۲۰۱۷ء)، ص ۲۵۔

xii ۔ طاہرہ اقبال،ڈاکٹر، نیلی بار، ص۲۰۸۔

xiii ۔ ایضاً، ص۲۰۸۔

xiv ۔ فخر الکریم،ڈاکٹر،"بیسویں صدی میں اردو ناول چند مباحث"، ادبیات، شمارہ نمبر ۲۳، ۲۴(پاکستان، اکادمی ادبیات، جنوری تاجون ۲۰۲۰ء)، ص۴۹۔

xv ۔ مشرف عالم ذوقی، پوکے مان کی دنیا(لاہور: جریر پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص۵۶،۵۷۔

xvi ۔ ایضاً، ص۱۷۷۔

xvii ۔ ایضاً، ص۲۶۔

xviii ۔ ایضاً، ص۹۳۔

xix ۔ احمد صغیر،ڈاکٹر، اردو ناول کا تنقیدی جائزہ، ۱۹۸۰ء کے بعد (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۸ء)، ص۱۶۶۔